© rasailojaraid.com

قرآن اپنے متعلق کیا کہتا ہے؟

از جناب مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی

(۷)

علیّ ایک حقیقت نگاہ ہستی ان بصیرت افروز صفاتِ عالیہ پر جب عمیق نظر ڈالتی ہے تو بے ساختہ اس کو یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ بلا شبہ قرآن اپنی تمام پیشرو کتبِ سماویہ کے مقابلہ میں رفیع الشان اور جلیل القدر ہے اور علوِ مرتبت و رفعتِ قدر کا حامل ہے کیونکہ نہ کوئی کتاب اس کے اعجازِ بیان کو پہنچتی ہے اور نہ اسرارِ الٰہیہ و غوامضِ کونیہ میں کسی کو اُس کی ہمسری حاصل ہے۔ اور کیوں نہ ہو جبکہ اللہ تعالیٰ کی ذاتِ احدیت و صمدیت خود "علی۔ بلند تر" ہے۔ اور جبکہ اس کے محبوب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت "علی" ہے، پھر قرآن کی صفت اگر "علی" نہ ہوتی تو یقیناً وہ کلام اللہ بھی نہ ہوتا اور نہ دوسری کتب سماویہ کی طرح اس کے نظم و معانی اعجاز کا خزینہ ہوتے اس لئے کہ اگر یہ مثل صحیح ہے کہ "کلام الملوک ملک الکلام" تو کیا وجہ کہ یہ بھی حق اور صحیح نہ ہو کہ "کلام الالٰہ معجز الکلام" یعنی جب خدا کی ذاتِ بحت بے ہمتا و بے مثال ہے تو اس کا کلام بھی دوسری تمام کتبِ سماویہ کے سامنے بے مثال اور معجز ہے اس لئے اس کی علو شان اور رفعتِ مکان مسلم اور حقیقتِ ثابتہ ہے۔

علاوہ ازیں تورات و زبور ہو یا انجیل و صحف تمام پیشرو الہامی کتابیں نہ نسخ و تنسیخ سے محفوظ رہ سکیں اور نہ تحریف و تبدیل سے اور اسی بنا پر آج خود اہلِ کتاب کو اعتراف ہے کہ اُن کے پاس موجودہ سماوی کتابیں خود ان نبیوں اور رسولوں کے زمانہ میں مرتب و مہذب موجود نہیں تھیں بلکہ عرصہ دراز

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے بعد اُن کے حواریوں یا پیروانِ ملت نے ان کو موجودہ شکل میں پیش کیا ہے لیکن قرآن کا یہ طغرائے امتیاز ہے کہ اس کی نظم و ترتیب ہمہ قسم کی تحریف و تبدیل سے محفوظ اور اس کے احکام نسخ و تنسیخ سے مبرا ہیں اس لئے بھی وہ تمام پیشرو کتابوں کے بالمقابل "علی" ہے "بلند و بالا" ہے۔

وَاِنَّهٗ فِیۡۤ اُمِّ الۡكِتٰبِ لَدَیۡنَا لَعَلِیٌّ حَكِیۡمٌ ؕ — اور بلاشبہ قرآن لوحِ محفوظ میں (محفوظ) ہے ہمارے نزدیک یقیناً بلند و بالا اور مضبوط و مستحکم ہے۔

وہ لوحِ محفوظ میں مصئون و محفوظ ہے کہ جس کو نہ قلمِ خطا و نسیان بھلا سکتا ہے اور نہ اس پر خطِ نسخ و تحریف جاری ہو سکتا ہے اور پھر خدائے برتر کے ساتھ اس کی نسبت کا یہ حال ہے کہ تمام الہامی کتابوں کے مقابلہ میں یہ اس کے نزدیک مرتبہ کے لحاظ سے "علی" ہے اور رفعت و قدر کے پیش نظر "حکیم" ہے گویا جو صفات ذاتِ موصوف میں علیٰ وجہ الکمال موجود ہیں اُن کا کامل و مکمل عکس اس کی صفتِ کلام قرآن میں بھی جھلک رہا ہے اور اسی نسبت و قربت کی وجہ سے وہ بھی ان صفات کا موصوف ہے وذٰلك فضل الله يؤتيه من يشاء والله ذو الفضل العظيم۔

حکمۃ | تو اب یہ کہنے میں بھی تصنع، عبارت آرائی، یا مبالغہ آمیزی نہیں ہے کہ جو کتاب ان عالی قدر و عظیم المرتبہ صفاتِ کمالیہ کی حامل ہو وہ "حکمۃ" ہی "حکمۃ" ہے۔

"حکمۃ" دانائی اور صحیح فراست کا نام ہے ایسی فراست جب کہ اس سے رہنمائی اور رہبری کا کام لیا جائے تو حقیقی سعادت کا باعث ثابت ہو۔ تو اس مفہوم کے لحاظ سے قرآن حکمت ہی نہیں بلکہ "حکمتِ بالغہ" ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ نزولِ قرآن کے وقت تمام عالمِ انسانی روحانی درد و کرب میں مبتلا تھی اور اس کا ہر ایک گوشہ نقص و خام کاری میں آلودہ تھا۔ غرض حقیقی راہنمائی و قیادت سے سب ہی محروم تھے۔ ایسے تاریک دور میں قرآن کی مشعلِ ہدایت اور حکمتِ بالغہ نے دستری اور دستگیری کی اور زندگی اور مابعد زندگی کے لئے وہ نسخۂ حیات اور اکسیرِ ہدایت پیش کیا کہ حکیم و دانا اور فیلسوف

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حیران وانگشت بدنداں ہوکر رہ گئے۔ اور وہ مسلمان ہوئے ہوں یا نہ ہوئے ہوں لیکن جلد یا بدیر سب ہی کو تسلیم کرنا پڑا کہ قرآن بلاشبہ حکمت ہے اور حکمتِ بالغہ ہے۔

اُس نے نازل ہوکر توحید کا پیغام سنایا اور شرک سے نفرت دلائی، اُس نے پیغمبرانِ خدا کو خدا اور خدا کا بیٹا مان لینے یا عام انسانوں کی طرح اُن کے پیغامات کو بھی محض انسان اور بشری خیالات بتلاکر غیر الہامی قرار دینے کی افراط و تفریط سے بچایا، اُس نے انسانی معاشرت کی اصلاح کی، معاشی اقدار کو عدل و نصفت کے سانچہ میں ڈھالا، اُس نے انسانوں کو انسانیت کا سبق دیا بلکہ انسانیت کبریٰ تک پہنچایا۔ اسی تعلیم کا نام حکمت ہے اور ایسے ہی پیغام کو حکمتِ بالغہ کہا جاتا ہے۔

حضرت نوح علیہ السلام کا اپنی قوم کے ساتھ مذاکرہ، حضرت ہود و صالح علیہما السلام کا اپنی قوم سے مناظرہ، حضرت ابراہیم علیہ السلام کا نمرود سے مجادلہ، حضرت موسیٰ علیہ السلام کا فرعون سے مقابلہ، غرض حق و باطل کے وہ تمام مظاہر جن کا ذکر انبیاء و رسل علیہم السلام اور ان کی امتوں کے سلسلہ میں آیا ہے اسی حکمت اور حکمتِ بالغہ کے شواہد و نظائر ہیں۔

خدا کی توحید، رسول کی رسالت، معاد کا اثبات، معاشرت و معاشیات کی اصلاح، غرض وہ کونسا پہلو ہے جس کو حکمتِ بالغہ کے ذریعہ محکم دلائل و روشن براہین کی شکل میں اُس نے پیش نہ کیا ہو ہر ایک پہلو کو اس کی نمایاں خصوصیات کے ساتھ نمایاں کیا اور حکمت و دانائی کی راہ سے تمام پہلوؤں کے حقائق کو ممتاز بھی کیا اور ان کے درمیان تعلق و ربط بھی قائم کر دکھایا۔ سو یہی ہے وہ حقیقتِ عالیہ جس کو قرآن نے اس اعجاز بلاغت کے ساتھ بیان کیا ہے۔

حِكْمَةٌ بَالِغَةٌ فَمَا تُغْنِ	(قرآن) پوری عقل کی بات ہے پھر ان پر موثر
النُّذُرُ (القمر)	نہیں ہوتے ڈر سنانے والے۔

الحاصل قرآن کا یہ دعویٰ بھی اپنی جگہ حق و صداقت پر مبنی ہے کہ وہ ایسی بے نظیر کتاب،

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بے مثال، بے ہمتا موعظت ہے کہ جس کا ہر ایک جملہ اور ہر ایک کلمہ حکمت اور حکمتِ بالغہ ہے۔

حبلُ اللہ سطورِ بالا سے جب یہ واضح ہو چکا کہ قرآن ایسی کتاب، ایسا کلام، اور ایسی موعظت ہے جو روشن برہان، محکم حجت، واضح بیان ہے اور اس کی تعلیم حکمت اور حکمتِ بالغہ پر مبنی ہے تو پھر کون انکار کر سکتا ہے کہ وہ خدا کی مضبوط رسی ہے۔

حبل کے معنی رسی کے ہیں اور حبل اللہ خدا کی رسی کو کہتے ہیں۔ رسی چند ایسے دھاگوں کے مجموعہ کا نام ہے جو بٹے جا کر اور انفرادی حیات کو اجتماعی زندگی پر قربان کر کے ایک مضبوط شے بن جاتے ہیں اور وہ نہ یہ کہ خود مضبوط ہو جاتے ہیں بلکہ دوسرے بھی ان کی مضبوطی کا سہارا اور آسرا ڈھونڈنے لگتے ہیں، تم نے ایک دھاگے کو خواہ وہ سوت کا ہو سن کا ہو یا ریشم کا دیکھا ہو گا کہ جب کوئی شخص اس پر زور آزمائی کرتا ہے تو بآسانی اس کے ٹکڑے کر دیتا ہے لیکن تم نے یہ بھی ضرور دیکھا ہو گا کہ جب چند دھاگے مل کر ایک بٹے ہوئی رسہ کی شکل اختیار کر لیتے ہیں تو چند بہادر انسانوں کی رسہ کشی کے باوجود وہ ٹس سے مس نہیں ہوتے اور کثرت نے وحدت کی جو صورت اختیار کر لی ہوتی ہے اُس کے بل بوتہ پر خود بھی محکم اور پائیدار رہتے ہیں اور دوسروں کی پائیداری کے لئے بھی سینہ سپر بن جاتے ہیں۔

قرآن کہتا ہے جس طرح مادی دنیا میں "حبل متین" بے سہاروں کا سہارا اور بے پناہوں کی پناہ ثابت ہوتی ہے اور خود بھی محکم و استوار رہتی اور دوسروں کی استواری کے لئے ممد و معاون بنتی ہے۔ اسی طرح عالمِ روحانیات میں بھی "حبل متین" کے بغیر خدا طلبی اور خدا رسی ناممکن ہے اور گو اس کا وجود ہر ایک دور اور ہر ایک زمانہ میں رہا ہے لیکن مقتضیاتِ زمانہ اور تاثراتِ ماضیہ کے مطابق وہ ہمیشہ ایک مخصوص وقت تک کارگر ثابت ہوئیں اور وقتِ معینہ کے بعد چارہ گر نہ بن سکیں میرا وجود اس معاملہ میں بھی دوسروں سے ممتاز اور جدا ہے اور میں وہ روحانی حبل متین ہوں جو تا قیامِ قیامت ہر ہاتھ بڑھا کر سہارا لینے والے کو سہارا دیتی اور گرفت میں لینے والوں کے لئے آسرا بنتی ہوں اور اس لئے "حبل اللہ المتین" ہوں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یعنی میں سوت، سن، ریشم یا لوہے کی رسّی نہیں ہوں کہ پانی میں گل جاؤں یا مٹی میں رل جاؤں یا ریشہ ریشہ ہوکر فنا کے گھاٹ اُتر جاؤں اور نہ میں وقتی تقاضا اور ہنگامی ماحول کی صدائے بازگشت ہوں کہ وقت اور ہنگام کے تقاضوں کو پورا کرکے موت کی آغوش میں سو جاؤں بلکہ ان کے برعکس میں خدا کی وہ رسی ہوں اور حبل اللہ ہوں جس کا وجود مستقبل کی آخری ساعات سے وابستہ ہے اور جس کی دسترس معاش سے معاد تک ابدی وصف کے ساتھ متصف ہے۔

پس جو خوش بخت میرا سہارا لیتا ہے وہ شادکام و بامراد ہوتا ہے اور جو بدبخت میرے سہارے سے بے پرواہ ہوکر رہِ منزل بنتا ہے وہ ناکامی و خسران کا منہ دیکھتا ہے۔

لہٰذا یہ واضح رہے کہ میری جانب دوڑنے والے اور سہارا تلاش کرنے والے اپنی انفرادیت کو اجتماعیت میں جذب کرکے آئیں اور علیحدہ علیحدہ نہیں بلکہ مجتمع ہوکر اس کو پکڑلیں تاکہ اس کا ثمرہ اور نتیجہ ہر حیثیت سے بہتر اور مفید ثابت ہو۔ کیونکہ انفرادی زندگی درحقیقت زندگی نہیں ہے بلکہ زندگی کا سراب ہے حقیقی حیات تو دراصل اجتماعی حیات ہی کا نام ہے اور وہ انسانوں کو بلند مراتب اور اعلیٰ درجات پر فائز کرتی اور خدا کی درگاہ میں مقبول بناتی ہے۔ اس لئے کہ نہ تشتت و افتراق میرا شیوہ ہے اور نہ میری تعلیم کی یہ روح ہے بلکہ اجتماعی زندگی کے لئے یہ راہ مہلک اور بے پناہ ہے۔ میرا مقصد تو صرف یہ ہے کہ کسی طرح بچھڑے ہوؤں کو ملاؤں، افتراق کو مٹا کر وحدت پیدا کروں اور اس طرح خدا کی اس رسّی کو مضبوط پکڑنے والوں کو یک دل و یک جان بنادوں تاکہ انشقاق و تحزب کا انسداد ہوکر تمام کائناتِ انسانی ایک ہی "اخوت" کے دامن میں سما جائے اور دوئی کا اختلاف درمیان سے ہٹ جائے۔

غرض میرا مقصد، میری تعلیم، میرا جذبہ، میرا فیصلہ سب اسی ایک بات پر مرکوز ہیں کہ جو شخص "حبل اللہ" کو اجتماعی حیثیت میں گرفت کرے گا وہی منازل علیا کو حاصل کرسکے گا اور جو تشتت و تحزب کا طالب ہوگا وہ بے جان لاشہ کے سوا کچھ نہ پاسکے گا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

واعتصموا بحبل اللہ جمیعاً — اور اللہ کی رسّی کو مضبوط پکڑلو اور باہم افتراق
ولا تفرقوا۔ — نہ پیدا کرو۔

قیّم پھر یہ بھی ایک حقیقتِ ثابتہ ہے کہ قرآن اگر "حبل اللہ" ہے اور خدا کی مضبوط رسّی جو وصول الی اللہ کے لئے کافی ووافی ہے تو از بس ضروری ہے کہ وہ سیدھی اور راست ہو اور اس میں کسی قسم کی بھی کجی نہ ہو تاکہ رہ روِ راہِ طریقت منزلِ مقصود تک آسانی اور سہولت سے پہنچ سکے، ظاہر ہے کہ جو رسی ٹیڑھی اور کج مج ہوگی اس کا سہارا لینے اور اس کو پکڑ کر منزل تک پہنچنے والا کب کجی اور کجروی سے محفوظ رہ سکتا ہے البتہ یہ بات جدا ہے کہ وہ راہ ہی راہِ مستقیم نہ ہو اور جادۂ استقامت کے برعکس ہو لیکن راہِ حق تو بہر حال "صراطِ مستقیم" ہے اور اس کی استقامت میں کسی کو بھی کلام نہیں ہو سکتا۔ تب یہ بھی لازم ہے کہ "راہِ مستقیم" کی معراج تک پہنچنے کے لئے جس حبلِ متین کو کام میں لایا جائے وہ بھی زیغ و کجی سے مستقیم اور سیدھی ہو۔

پس قرآن حکیم یہ بھی دعویٰ کرتا ہے کہ وہ ایسی حبل اللہ (خدا کی رسّی) ہے جو ہر طرح کجی اور کجروی سے مامون و مصئون ہے یعنی نہ اس میں افراط ہے کہ اس کے اوامر و نواہی بندگانِ خدا کے لئے مصیبت و عذاب بن جائیں اور نہ تفریط ہے کہ جس میں وہ ضروری احکام تک موجود نہ ہوں جن کی ضرورت اور حاجت ہے اور یہ کہ ان کی تکمیل کے لئے کسی دوسری الہامی کتاب کی احتیاج محسوس ہونے لگے چنانچہ قرآن نے اسی حقیقت کو دوسرے مقام پر اس طرح واضح کیا ہے۔

"مافرطنا فی الکتاب من شئ" — ہم نے الکتاب (قرآن) میں کسی شے کی کمی نہیں کی

یہی وجہ ہے کہ وہ الہامی کتابوں میں "آخر کتاب" قرار پائی اور اس کا پیش کرنے والا پیغمبرؐ خاتم الرسل والانبیاء کے معزز لقب سے سرفراز و ممتاز ہوا۔

یا اس لئے "قیّم" ہے کہ معاش و معاد کے تمام بنیادی مسائل اور بندگانِ خدا کے تمام مصالح

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے لئے متکفل اور ضامن ہے اور اپنے اس وصف میں ہر طرح مستقیم اور کجی سے منزہ ہے۔ گویا مختصر الفاظ میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ وہ ایسی کتاب ہے جو ہر قسم کے نقائص سے پاک اور ہر طرح کے فضائل سے مزین ہے اور اسی حقیقت کا دوسرا نام "قیم" ہے۔

قرآن نے اپنی اس صفت کا اظہار منفی اور مثبت دونوں پہلوؤں سے کیا ہے اور یہ کہا ہے "ولم یجعل لہٗ عوجا" "قیما" اب ادبی اعجاز کے لحاظ سے خواہ ان دونوں جملوں میں سے ایک دوسرے کی تاکید تسلیم کیجئے یا دونوں کو جدا جدا مفاہیم کے اعتبار سے قبول فرمائیے۔ ہر دو تعبیرات کی صحت کا ثمرہ اور نتیجہ ایک ہی نکلتا ہے اور یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جس طرح کائنات میں ہر شے کی خصوصیات کا اظہار دو ہی پہلوؤں سے ہوا کرتا ہے ایک مثبت اور دوسرا منفی یا ایک ایجابی اور دوسرا سلبی حتیٰ کہ خدا کی الوہیت کے ایقان و اعتقاد کا کلمہ "لا الٰہ الا اللہ" بھی ان ہی ہر دو پہلو کا اعلان کرتا ہے اسی طرح قرآن بھی ان دونوں گوشوں سے اپنی حقیقت کا اظہار ضروری سمجھتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میں ایسی کتاب ہوں جس میں خدا نے کسی قسم کی بھی کجی نہیں رکھی اور اس لئے افراط و تفریط سے پاک "معتدل المزاج" ہوں اور ایسی صورت میں یہ بھی صحیح ہے کہ جس شے میں "عوجاج" (کجی) نہ ہو وہ بلا شبہ "قیم" ضرور ہے اور یہ بھی درست ہے کہ صرف یہی نہیں ہے کہ مجھ میں کجی نہیں ہے اور اعتدال ہے بلکہ اس سے زائد یہ وصف بھی رکھتا ہوں کہ میں معاش و معاد انسانی کے تمام بنیادی گوشوں پر حاوی اور اوامر و نواہی خداوندی کے کامل و مکمل اصولوں پر مشتمل ہوں اور اسی بنا پر میں "قیم" ہوں۔

پس غور کیجئے کہ جو کتاب اعوجاج سے منزہ اور استقامت سے مزین ہو وہی اگر "حبل اللہ" نہ ہوگی تو پھر کس کتاب کو یہ رتبہ حاصل ہوگا۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَنْزَلَ عَلٰی عَبْدِهِ الْکِتٰبَ	اس اللہ کیلئے ہر قسم کی ستائش زیبا ہے جس نے اپنے بندہ
ولم یجعل لہ عوجا قیما (کہف)	(محمد صلی اللہ علیہ وسلم) پر الکتاب (قرآن) کو نازل کیا اور نہیں ٹھیرایا اس کتاب کیلئے کجی کو اور نازل کیا اس کو مستقیم۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

العروۃ الوثقیٰ اس زمانہ میں چار اور شربت کی پیالی اور فنجان کس نے نہیں دیکھیں اور نہیں برتیں کیا اس کو گرفت میں رکھنے کے لئے قبضہ کی ضرورت نہیں ہوتی؟ ضرور ہوتی ہے۔ پس اگر یہ قبضہ مضبوط ہے تو پیالی کار مفوضہ بخوبی انجام دے سکے گی ورنہ کمزور قبضہ اگر ٹوٹ گیا تو پیالی بھی شکست ہوئی اور قبضہ بھی فوت ہوا۔ نیز اگر کوئی شخص درخت پر چڑھا ہوا ہے تو اس کو اپنی حفاظت کے لئے ضروری ہے کہ ایسی شاخ کو پکڑے جو خود بھی مضبوط ہو اور اس کے سہارے کیلئے بھی مضبوطی کا باعث بن سکے۔

قرآن حکیم نے بھی ایک جگہ اسی تمثیل کو اختیار کیا ہے اور اس جانب توجہ دلائی ہے کہ یہ درحقیقت جامِ شریعت اور شجرِ ایمان کے لئے "عروۂ وثقیٰ" ہوں پس جو شخص جامِ شریعت سے شاد کام ہونا چاہتا ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ مجھ کو قبضۂ جام سمجھ کر مضبوطی سے پکڑے تاکہ اپنے مقصد میں کامران و کامیاب ہو یا جو شخص شجرِ ایمان کی پناہ لینا چاہتا ہے اُس کا فرض ہے کہ وہ مجھ کو مضبوط شاخ سمجھ کر اچھی طرح گرفت میں لے تاکہ اس کو حقیقی پناہ نصیب ہو سکے۔

لیکن قرآن تو عالم رشد و ہدایت اور کائناتِ معاش و معاد کا ایک مکمل دستور ہے جو ہر گوشۂ زندگی کے لئے مصلحِ اعظم اور انقلاب آفریں ہے لہٰذا وہ تو خود ہی جامِ شریعت اور شجرِ ایمان ہے پھر اس کو "عروۂ وثقیٰ" کہنے کے کیا معنی؟ تو خود قرآن ہی نے اس اشکال کو اس طرح حل کر دیا کہ جو شخص اللہ پر ایمان و اعتقادِ صحیح رکھتا اور طاغوت کی ہر بات کا انکار کرتا ہے تو یہ ایمان باللہ اور کفر بالطاغوت گویا پورے قرآن کی حقیقی تفسیر ہیں۔ اور ان پر استقامت کے ساتھ قائم رہنا بلاشبہ قبضۂ جام اور شاخِ شجر کو مضبوطی سے پکڑ لینا ہے تو درحقیقت جام و شجر نے اپنے ظہور و نمود کو قبضہ و شاخ کہہ کر واضح کیا ہے اور یہ طریقۂ تعبیر اعجازِ بلاغت کا ایک کرشمہ ہے۔

فمن یکفر بالطاغوت ویومن	پس جو شخص طاغوت (شیطان) سے سرکشی کرے
باللہِ فَقَدِ اسْتَمْسَکَ بِالْعُروۃِ الْوُثْقیٰ	اور اللہ پر ایمان لائے تو بلاشبہ اس نے مضبوط شاخ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لاانفصام لہا واللہ سمیع علیم۔ (بقرہ)

(یا) مضبوط قبضہ کو پکڑ لینا جس کو انقطاع (ٹوٹنے یا کٹ جانے کا اندیشہ) نہیں اور اللہ سننے والا جاننے والا ہے

اس حقیقت کا متعدد بار اظہار کیا جا چکا ہے کہ خدائے تعالیٰ کی ہستی بے سہیم ہمتا اور یکتا ہے، اس لئے اس کی خالقیت و مالکیت میں بھی اس کا کوئی ہمسر و ہمدم نہیں ہو سکتا اور جبکہ وہ احد و یکتا ہے تو اس کا قانون قدرت بھی سارے عالم پر یکساں اور مساوی کارفرما ہے یہ نہیں ہے کہ مادیات و محسوسات کے لئے ایک قانون قدرت ہے اور روحانیات و مدرکات کے لئے دوسرا اور اس طرح خدا کی خدائی دو متضاد و متقابل کارفرمائیوں کے ماتحت ہو۔ تو جب فطرت تمام محسوسات و معقولات، مادیات و روحانیات سب پر ایک ہی طرح عامل ہے تب ضروری ہے کہ ماورار مادیات کے مسائل کو سمجھانے اور فہم سے قریب لانے کے لئے مادیات و محسوسات کو بطور تشبیہ، استعارہ اور تمثیل کے استعمال کیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن اپنے اعجاز بیان کے ساتھ جگہ جگہ حسب تقاضا اسلوب عالم روحانیات کی باتوں کو عالم مادیات کی اشیار کے ساتھ تمثیلی، تشبیہی اور استعاری رنگ میں ذکر کرتا اور افہام و تفہیم کے لئے سہولت بہم پہنچاتا ہے اور یہی وہ حقیقت ہے جس کو قرآن نے اپنے امتیاز و اوصاف یا اپنی خصوصیات کو بیان کرتے ہوئے پیش نظر رکھا اور "واعتصموا بحبل اللہ جمیعا" میں قرآن کو "حبل اللہ" سے اور "فقد استمسک بالعروۃ الوثقیٰ" میں "عروۃ وثقی" سے تعبیر کیا اور ان استعارات کو ذکر کر کے اس حقیقتِ حال کی جانب توجہ دلائی کہ قرآن ایک ایسا دستورِ کامل اور ایسی کتاب محکم ہے جس پر عامل ہونے اور امتثال اوامر و نواہی کرنے کے بعد کوئی شخص گمراہ نہیں رہ سکتا اور بلاشبہ اس نے خدائے برتر کے ساتھ ایسا محکم و مضبوط رشتہ قائم کر لیا جس کو کوئی طاغوتی قوت شکست و ریخت نہیں کر سکتی۔

غالباً اس لطیف مگر عریاں حقیقت کو پیشِ نظر لا کر خاتم الانبیار محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نے بھی ایمان کو درخت سے تعبیر فرمایا اور اعتقادات و اعمال کو اس کی جڑ اور شاخیں قرار دیا۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ایمان
الایمان بضع وسبعون شعبۃ	کی کچھ اوپر ستر شاخیں ہیں ان میں سے بلند و بالا
افضلھا قول لا الٰہ الا اللہ و	کلمۂ لا الٰہ الا اللہ ہے اور چھوٹی سی شاخ راہ سے
ادناھا اماطۃ الاذٰی عن	خس و خاشاک دور کر دینا ہے اور حیاء بھی
الطریق والحیاء شعبۃ من الایمان	ایمان ہی کی شاخ ہے۔

"لا انفصام لھا" کہہ کر قرآن اس کو بھی واضح کر دینا چاہتا ہے کہ گو قرآن کو "حبل اللہ" رسی کے اور "العروۃ الوثقٰی" شاخ شجر یا قبضۂ جام سے تشبیہ دی گئی ہے لیکن مشابہت صرف اسی پہلو میں منحصر ہے کہ جس طرح ان کو مضبوط پکڑ کر مادی اور حسّی کار برآری ہو جا سکتی ہے اسی طرح روحانی سعادت اور ابدی و سرمدی فلاح کی کامرانی قرآن کو مضبوط پکڑنے سے وابستہ ہے لیکن قرآن ان تشبیہی امور سے کہیں بلند و برتر ہے اس لئے کہ قبضۂ جام اور شاخِ شجر خود اپنی جگہ کمزور اور ناپائیدار ہوتے ہیں اور اکثر و بیشتر یہ ہوتا رہتا ہے کہ جام موجود ہے مگر قبضہ شکست ہو گیا، یا درخت باقی ہے مگر وہ شاخ کہ جس پر تکیہ تھا ٹوٹ گئی لیکن قرآن اس طرح کا "عروۂ وثقٰی" نہیں ہے بلکہ وہ تو خود بھی محکم و مضبوط اور ابدی و سرمدی ہے اور دوسروں کے لئے بھی ایسا مضبوط ہے کہ جس کے لئے نہ انقطاع ہے اور نہ انفکاک پس جو بھی اس کا امتثال کرتا ہے ابدی فوز و فلاح پاتا ہے اور کیوں نہ ہو جبکہ یہ اس مالکِ حقیقی کا کلام معجز نظام ہے جو سمیع ہے اور کوئی نیت اور کوئی عمل اس کی سماعت سے باہر نہیں جو علیم ہے اور کوئی شے اور کوئی کام اس کے علم سے خارج نہیں۔

الوحی سطورِ بالا سے یہ بخوبی واضح ہو گیا کہ قرآن کی رشد و ہدایت اور تبلیغ و دعوۃ کا معیار کس قدر بلند اور رفیع ہے اور اس راہ میں اُس کی بے مثال رعنائیوں اور خوبیوں نے عالمِ انسانی کے نشو و ارتقار

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور اصلاح احوال و مدارج کی کیسی بے نظیر تصویر پیش کی ہے؟ اور یہی نہیں کہ اس کے انقلاب کی صدا نے صرف روحانیات کی منزلِ آخر کے لئے رہنمائی کا حق ادا کیا بلکہ دینی و دنیوی سعادت کو اس مرتبۂ علیا پر پہنچا دیا کہ عقل و خرد کے نزدیک جس سے آگے کوئی منزل باقی نہیں رہتی۔

یہ تو آپ بارہا سن چکے ہیں کہ کائناتِ مادی میں جبکہ قانونِ فطرت ہر ایک آغاز کے لئے انجام ضروری قرار دیتا ہے اور یہ کہ انجام اُس حقیقت کا نام ہے جس کے بعد انتظار اور توقع کے لئے کوئی جگہ باقی نہیں رہتی تو اس کہنے میں کیوں تامل کیا جائے کہ اسی طرح عالمِ روحانیات کا وہ آغاز جو آدم (علیہ السلام) یا پہلے انسان سے ہوا تھا اس کے ارتقائی منازل کی آخری کڑی یا اُس آغاز کے انجام کا ہی دوسرا نام قرآن ہے۔

کیا تم اس کا انکار کر سکتے ہو کہ بچہ جب اس عالمِ مادی میں قدم رکھتا ہے تو اس کی حاجات و ضروریات بہت ہی محدود ہوتی ہیں اور وہ اپنی ماں کے ماسوا کسی سے واسطہ نہیں رکھتا پھر جوں جوں اس کی زندگی کے لمحات آگے بڑھتے اور نشو و ارتقاء کی منازل سے گذرتے جاتے ہیں اس کی ضروریات کا ماحول بھی وسیع ہوتا جاتا ہے اور والدین سے شروع ہو کر اعزہ و اقربا، محلہ، مکتب و مدرسہ، شہر و ملک تک پہنچ جاتا ہے اور اگر استعداد و صلاحیت، رفعت و عظمت کی سربلندیوں کے ساتھ مطابقت رکھتی ہے تو ایک دن ساری کائنات کے ساتھ اس کا رشتۂ حیات وابستہ ہو جاتا ہے۔

یہی ماحول انسان کی اجتماعی زندگی و حیات کا ہے کہ گھر سے شروع ہو کر آخر کار ساری کائنات اُس کی آغوش میں سما جاتی ہے اور کائنات کے وہ تمام امتیازات جو خاندان، قبیلہ، برادری، قوم اور ملک کے نام پر قائم تھے مٹ کر خدا کی تمام مخلوق ایک کنبہ بن جاتی ہے۔

گویا انفرادی زندگی میں جس طرح ایک انسان طفولیت، صبارت اور مراہقت کے درجات طے کرنے کے بعد شباب کے عروج کو حاصل کر لیتا ہے اُسی طرح اجتماعی زندگی بھی ان امتیازاتِ اول سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

گذر کر "وحدتِ انسانی" کے عروج وارتقا پر پہنچ جاتی ہے اور یہی اُس کی آخری منزل اور مقصد حیات قرار پاتی ہے۔

ٹھیک اسی طرح عالم روحانیات پر بھی طفولیت وصبارت کا دور آتا ہے اور رشد وبلوغت کا عروج وارتقار بھی حاصلِ وجود بنتا ہے اور اس منزل پر پہنچ کر کسی مزید نشو وارتقا کی حاجت باقی نہیں رہتی تو اس حقیقت کے پیشِ نظر جب ہم خدا کے پیغام اور نبیوں اور رسولوں کی رسالت کے ملّی اور دینی ادوار پر نگاہ ڈالتے ہیں تب ہم کو یہ صاف نظر آتا ہے کہ انسانِ اول کے دور میں جس پیغام نے بساطِ دنیا پر صور پھونکا وہ اول اول بہت ہی محدود دائرہ رکھتا ہے اور پھر آہستہ آہستہ وسعت اور عروج ارتقار کی منازل پر گامزن ہوتا نظر آتا ہے تاہم ملکی اور قومی امتیازات کی حدود سے بے نیاز نہیں ہے لیکن جب وہ وقت آپہنچا کہ بنی آدم اپنی نسلی بقار کے لحاظ سے سنِ رشد وبلوغ کو پہنچ جانے والی تھی اور اس کے ذہنی ودماغی نشو ونما نے ارتقائی منزل کی آخری سیڑھی پر قدم رکھدیا تھا تو یہ تقاضائے وقت ضروری ہوا کہ اب ایک پیغام آئے جو خدائے واحد کی جانب سے تمام انسانی برادری، بلکہ انسانیت کے لئے "وحدت" کا پیغام ثابت ہو اور یہ شرف اُسی پیغام کو حاصل ہو سکتا تھا جو ابتدائی اور وسطانی دور کے پیغامات کے مقابلہ میں روحانیات کے رشد وبلوغت کا حامل ہو اور جس کے اساسی اور بنیادی اصولوں میں ارتقا کی وہ روح موجود ہو جس کے بعد کسی روحِ حیات اور صدائے حق کی تجدید کی ضرورت باقی نہ رہے اور یقیناً بے جا نہ ہوگا اگر یہ کہا جائے انسانوں کے روحانی ارتقا کی تاریخی روشنی میں قرآن کے علاوہ کسی دوسرے پیغام کو یہ شرف حاصل نہیں ہے اور اس لئے رہتی دنیا تک ہر قسم کے روحانی انقلابات واصطلاحات کا مولد ومنشا صرف قرآن ہی رہے گا۔

لیکن اس مرحلہ پر پہنچ کر ہم کو اچانک ابتدار اور آغاز کی جانب نظر اٹھانا پڑتا ہے اور اس حقیقت کی کھوج لگانے کی فکر ہو جاتی ہے جس کو دینی اصطلاح میں "وحی" کہا جاتا ہے کیونکہ یہی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وہ حقیقت ہے جو کسی پیغام کو بشری اور انسانی پیغامات سے جدا کر کے کسی کلام یا کسی کتاب کو "پیغامِ الٰہی" قرار دیتی ہے۔

اگرچہ یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ آج کا انسان اپنے ذہنی و دماغی نشو و نما کے لحاظ سے اس درجہ کو پہنچ چکا ہے جس کو "رشد و بلوغت" کہا جاتا ہے مگر یہ بھی اسی دنیار مادی کا تجربہ ہے کہ جب کسی ذکی و فطین کی ذکاوت و فطانت حدِ اعتدال سے گذر جاتی ہے تو بسا اوقات وہ انسانی توازنِ دماغی کو کھو کر مالیخولیا اور جنون تک پہنچا دیتی ہے چنانچہ یہی حال انسانوں کی اجتماعی زندگی کا ہے خواہ وہ مادی حیات ہو یا روحانی یعنی جب انسان اس مقام پر پہنچ کر حدِ اعتدال سے آگے بڑھ جاتا ہے تو اس راہ میں بھی اس کی حالت ایک مجنون یا مالیخولیائی انسان کی سی ہو جاتی ہے اور وہ ایسے امور کو گذرتا ہے جو کسی طرح بھی سلامت روی اور اعتدال سے مطابقت نہیں رکھتے۔

پس کوئی تعجب نہیں ہے اگر آج کے علمی دور میں یہ صدا گوش آشنا ہو رہی ہے کہ اس مادی دنیا کا تعلق مادیات ہی تک محدود ہے اور ما ورار مادہ کوئی حقیقت موجود نہیں ہے اس لئے "وحی" بھی اُن خرافی تصورات و خیالات یا معتقدات کی ایک کڑی ہے جس کو دورِ جاہلیت میں انسانی دماغوں نے قبول کر لیا تھا ورنہ "وحی" نہ کوئی حقیقت ہے اور نہ مادیات کے علاوہ یہاں کوئی شے موجود ہے۔

علمار مادیین نے اس علمی دور کے شروع میں دینی تصورات اور روحانی اعتقادات کا جس طرح شدت سے انکار کیا اور ان کو جاہلی خرافات قرار دیا اُن میں سے انکارِ وحی کو بہت نمایاں حیثیت دی انھوں نے کبھی کہا کہ انسان پر جب عصبی بیماری یا کمزوری مسلط ہو جاتی ہے تو اس کو ہسٹیریا کی قسم کے دورے پڑنے لگتے ہیں اور وہ عالمِ بیہوشی یا نیم بیہوشی میں اوہام کی تخلیقی دنیا کے نئے نئے تماشے دیکھتا اور عجیب عجیب باتیں اور خبریں سنتا اور سناتا ہے۔ کبھی اس کو غیر معلوم آوازیں آتی ہیں اور کبھی مختلف اشکال سے متشکل انسانوں یا عجیب و غریب صورتوں کو دیکھتا اور محسوس کرتا ہے جو اس سے باتیں کرتی، یا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اشارات کے ذریعہ کچھ کہتی نظر آتی ہیں اور یہی مرض جب کسی ایسے انسان پر طاری ہوتا ہے جو نیک خو، نیک سیرت، ہمدردِ قوم، مصلحِ ملت ہو تو اس کے اپنے منتشر خیالات بیماری کے دورہ کے وقت تشکل ہو کر وہ سب کچھ ہو جاتے ہیں جن کا اظہار وہ شخص "وحی" کہہ کر کرتا یا فرشتہ کا نزول بتلا کر بیان کرتا ہے اور اگر وہ مریض نہیں ہے اور عصبی کمزوری میں بھی مبتلا نہیں ہے تو پھر وہ کذاب ہے اور جن باتوں کو "وحی" کہتا ہے ان کے بارے میں جھوٹ بولتا اور قصداً دھوکا دینا چاہتا ہے۔

بہر حال ان مادیین کے نزدیک جبکہ مادہ کے علاوہ نہ روح ہے اور نہ خدا اور نہ روحانیات کوئی شے ہے تو انکارِ وحی یقیناً اس کا ثمرہ اور نتیجہ ہی سمجھنا چاہیئے۔

فلسفۂ جدید اور انکارِ وحی و اقرار

سولہویں صدی عیسوی تک علماءِ مغرب بھی وحیِ الٰہی کے اسی طرح قائل تھے جس طرح آج بھی اسلام، نصرانیت اور یہودیت قائل ہے کیونکہ بائبل کی تعلیم بھی وحی کی حقیقت پر اس طرح یقین دلاتی ہے جس طرح قرآن کی تعلیم مگر جب سترہویں صدی میں علم کے نام سے شکوک کی دنیاءِ وسیع نے اپنا سکہ چلایا تو دین و مذہب کو بیکار ۲ اور وحی سے انکار کو علم کی روشنی قرار دیا اور اس کے اعتراف کو جہالت اور خرافات کی پیروی ظاہر کیا ابھی یہ دورِ ادیان و ملل کے اس اعتقاد پر مضحکہ خیزی ہی کر رہا تھا کہ انیسویں صدی کے وسط میں سب سے پہلے امریکہ اور اس کے بعد یورپ میں مادی علوم ہی کے ذریعہ ایک نئے علم و اکتشاف کا آغاز ہوا اور انہوں نے دین و مذہب یا رسومِ تقلیدی کی پیروی میں نہیں بلکہ علمی تجربیات کی فضا میں یہ اعلان کیا کہ یہاں صرف عالمِ مادیات ہی نہیں بلکہ مشاہد و محسوس مادیات کے علاوہ ایک اور عالم بھی ہے جس کو عالمِ ارواح کہنا مناسب ہے اور علمی تجربوں سے انہوں نے ثابت کیا کہ اگر مصنوعی طریقوں سے انسان کے مادی جسم اور حواس کو معطل کر دیا جائے تو پھر اس مادی شخصیت میں مستور روحانی شخصیت کارفرما نظر آئے گی اور اس کے ادراکات و علوم اور معرفت کی بلندی حیرت زا وسعت کے ساتھ عالمِ زیر و بالا تک رسا دیکھی جا سکے گی۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وہ کہتے ہیں کہ اس محسوس اور مادی انسان میں ایک روحانی شخصیت موجود ہے اور انسان درحقیقت اُسی کا نام ہے مگر ہمارے یہ حواسِ خمسہ اُس کے احساس و تعین سے قاصر ہیں البتہ جب ہماری یہ مادی شخصیت کسی مصنوعی عمل سے یا خواب کی وجہ سے معطل ہو جاتی ہے تب اس باطنی شخصیت کے جوہر کھلتے ہیں اور اس کے ادراکِ لطیف کی پہنائیوں تک پہنچنا مشکل ہو جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ مقناطیسی اثر سے کسی کو معمول بنا کر اُس پر مصنوعی نیند یا نیم بیہوشی طاری کر دیتے ہیں تو اُس کی مادی شخصیت مقہور ہو جاتی ہے اور باطنی شخصیت اس قید و بند سے آزاد ہو کر ان امور تک رسائی حاصل کر لیتی ہے جن کا اس کی مادی شخصیت کو علم تو کیا گمان تک بھی نہیں ہوتا تھا۔ ایسی حالت میں انسان بہت سے غیبی امور اور مستقبل کے حوادث کا علم حاصل کر کے دوسروں کو بھی بتا دیتا ہے اور جہاں تک اس کے مادی جسم نے رسائی تک حاصل نہ کی تھی ان دور دراز مقامات کو عیاناً اور مشاہدۃً دیکھ دیکھ کر ان کے متعلق دریافت کردہ سوالات کا دست بدست صحیح جواب دینے لگتا ہے۔

چنانچہ امریکہ و یورپ کے علمارِ روحانیین نے تقریباً تیس سال اس سلسلہ میں ہزاروں تجربے کئے اور بڑے بڑے علمارِ فلسفۂ روحانیات پر مشتمل کمیٹی نے ضخیم جلدوں میں ان کو مدون و مرتب کر کے دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔ ان کے علمی تجربوں نے متفقہ طور پر اس حقیقت کا اعتراف کرنے پر ان کو مجبور کر دیا کہ انسان اس حقیقت ہی کا نام نہیں ہے جو مادی شخصیت میں ہماری آنکھوں کے سامنے نظر آتی ہے بلکہ اس کے اندر ایک اور شخصیت مستور ہے اور وہی ان اعضارِ انسانی کے لئے باعثِ تکوین اور موجبِ تحریک ہے جو ظاہر انسان کے ارادہ و اختیار سے حرکت پذیر نہیں ہیں۔ مثلاً قلب، جگر، معدہ وغیرہ اس لئے اصل انسان وہ ہے نہ یہ جو محسوس و مشاہد ہے اور یہی وہ شخصیت ہے جو انسان کے جسمِ کثیف اور اس کے مادی افعال کے تعطل کی صورت میں قوی ہو کر مشاہد انسان کو ان امور سے باخبر کرتی اور ان علوم و معارف کا ادراک بخشتی ہے جو الہام یا وحی کہے جاتے ہیں گویا انسان یہ محسوس کرتا ہے کہ کسی خارجی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اثرات کے بغیر اُس کی جبلت وطبیعت ہی اس پر امورِ غائبانہ کا انکشاف کر رہی ہے۔

علماءِ روحانیین کی اس دریافت کا حاصل یہ ہے کہ انسان کے اندر ایسی قوتِ مدرکہ ودیعت ہے جس کا احساس حواس نہیں کر سکتے اور انسان نہیں سمجھ سکتا کہ وہ کیا ہے اور کس طرح ہے لیکن اس کے ثمرات اور عطا کردہ معارف و علوم اور ادراکات پر مشاہدہ سے زیادہ یقین رکھتا ہے اور ان ادراکات وعلوم کے مظاہرے اس قدر واضح اور یقینی ہوتے ہیں کہ خود وہی اُن کا اعتراف نہیں کرتا بلکہ دوسرے بھی اس کے اعتراف پر مجبور نظر آتے ہیں۔

مثلاً ایک شخص حساب سے قطعاً ناآشنا ہے اور اس کی عدم واقفیت اس کے رفقاء میں مسلم ہے تاہم جب مصنوعی طریقۂ تنویم سے اس کو نیم بیہوش کرنے کے بعد اس سے علمِ ریاضی کے مشکل سے مشکل سوالات کیے گئے تو اس نے فوراً ہی ایسے صحیح جوابات دیئے جن کو ماہرینِ علمِ ریاضی بھی کافی غور و خوض کے بعد دے سکتے تھے، اسی طرح مختلف ملکوں میں اس وقت جو ہو رہا تھا ایک دوسرے شخص پر بھی عمل کرنے کے بعد جب اس سے ان واقعات کے متعلق دریافت کیا تو اس نے ان واقعات کو اس طرح بیان کر دیا گویا وہ خود ہر واقعہ کو اپنی نگاہ سے دیکھ رہا ہے۔

اور یہی نہیں بلکہ تجرباتِ علمی اس کے شاہد ہیں کہ بعض اشخاص ایسے پائے گئے بچپن میں جبکہ اُن کی عمر ریاضی مسائل کے سمجھنے کے بھی قابل نہ تھی" یعنی ۸ - ۹ سال کی عمر میں علمِ ریاضی کے دقیق مسائل کو آسانی سے سلجھا دیا کرتے تھے مگر جب وہ جوان العمر ہوئے اور ان کے باطنی مدرکات پر کثیف ظاہری شخصیت اور حواس ظاہری کا دباؤ زیادہ پڑا تو وہ ان حیرت زا جوابات دینے سے قطعاً قاصر نظر آنے لگے۔ جن کو وہ بچپن میں آسانی سے حل کر دیا کرتے تھے۔

غرض ان کا دعویٰ ہے کہ انھوں نے خوش اعتقادی یا دینی تقلید یا ملکی و وطنی رسوم سے متاثر ہو کر نہیں بلکہ علمی تجربوں کی کسوٹی پر کس کر سیکڑوں انسانوں میں ایسے ہزاروں واقعات کا مشاہدہ کیا ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جن سے بآسانی یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ اس مادی کثیف انسان کے اندر ایک ایسی زبردست باطنی شخصیت موجود ہے جس کے لئے یہ جسم اور اس کے ظاہری حواس و اعمال حجاب بنے ہوئے ہیں اور بعض مخصوص حالات میں جب اس کو اس کثافت کے دباؤ سے آزادی نصیب ہو جاتی ہے یا اس کا دباؤ نسبتاً کم ہو جاتا ہے تو پھر باطنی شخصیت کے واسطہ سے اس کی روح متجلی انسان کو حیرت زا علوم و معارف اور ادراکات سے روشناس کراتی ہے۔ اور عظیم الشان انقلابات کا باعث بنتی ہے اور یہ مخصوص حالات کبھی مصنوعی ہوتے ہیں جو عمل تنویم یا طبعی خواب یا ریاضات و مجاہدات سے حاصل ہوتے ہیں اور کبھی فطری طور پر بچپن میں نمایاں نظر آتے ہیں اور جب عمر ترقی کر کے مادی انسان اور اس کے حواس قوی ہو جاتے ہیں تو یہ باطنی شخصیت اپنی کار فرمائیوں میں ماند پڑ جاتی اور بسا اوقات مستور ہو جاتی ہے۔

علماءِ مادیین کا یہ گروہ صرف اس لئے "روحانیین" کہلاتا ہے کہ ان کے نزدیک مادہ کے علاوہ ایسی باطنی روحی قوت موجود ہے جو اس قدر زبردست قدرت رکھتی ہے کہ اسبابِ ظاہر کی اعانت کے بغیر انسان کو علوم و فنون اور معارف و ادراکات کے لطائف و اسرار سے باخبر کرتی اور مادی اسبابِ معلومات کی نگاہ میں جو امور اور جو اشیاء پردۂ غیب میں ہیں ان کا مشاہدہ کرا دیتی ہے اس لئے ان کے علمی تجارب کا یہ فیصلہ ہے کہ "علم" نے ہمارے سامنے ایک بند دروازہ کھولدیا ہے اور کل جس کا ہم انکار کرتے رہے ہیں وہ آج ناقابلِ انکار حقیقت ہے مگر یہ وہ باطنی اور روحی طاقت ہے جو انسان کے اپنے اندر موجود ہے اور کسی دوسری مخلوق (فرشتہ) کے ذریعہ یا اور دوسرے ذرائع سے باہر سے نہیں بخشی جاتی۔ اور کبھی یہ کیفیت خواب کی حالت میں بھی طاری ہوتی ہے اور بسا اوقات ایک شخص نیند میں مستقبل کے واقعات کا روز روشن کی طرح مشاہدہ کر لیتا ہے یا جن مسائل کو بیداری میں لاینحل اور مشکل تر سمجھتا رہا ہے وہ خواب میں آن کی آن میں حل ہو جاتے ہیں۔

پس جو علماءِ مادیین اس کا انکار کرتے ہیں وہ در اصل حقائق کے منکر ہیں، نیز جو نیک خصال،

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کریم الاخلاق اشخاص قوموں اور ملکوں کی دینی و دنیوی سعادت کے لئے اصلاحی و انقلابی نظامِ حیات پیش کرتے ہوئے اس قسم کے علوم و معارف اور نکات کا مظاہرہ کرتے اور ان کو وحی یا الہام کہتے ہیں وہ نہ کاذب ہیں اور نہ مفتری ہیں اور نہ وہ دماغی اور غیر دماغی امراض کے مریض ہیں بلکہ اپنے دعوے میں سچے اور صادق القول ہیں۔ البتہ یا تو ان کو مغالطہ ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی باطنی شخصیت اور ملکۂ باطن کی قوتوں سے مرعوب ہو کر اس کو بشری طاقت سے خارج سمجھ لیتے ہیں اور یا قوتِ تخیل ایک عجیب الہیئت شخصیت کو متشکل کر کے ان کو یقین دلا دیتی ہے کہ یہ علم و عرفان اس فرشتہ کے ذریعہ حاصل ہوا ہے

غرض ایک انسان کا اپنی جسمانی زندگی کے لحاظ سے بہت سے امور کے لئے جاہل، غبی، اور ناکارہ ہونا اور پھر یک بیک باطنی قوت کے ذریعہ جولانیِ طبع، فکرِ روشن اور ذہن رسا کا مظاہرہ کرتے ہوئے دلوں کے پوشیدہ بھید، مستقبل و ماضی کے مستور کوائف و حالات کا انکشاف کرنا اور اقطاع و امصارِ بعیدہ تک پرواز کرتے ہوئے صحیح حالات سے مطلع کرنا اس بات کی صریح اور واضح دلیل ہے کہ اس کالبدِ خاکی میں ضرور ایک باطنی شخصیت پوشیدہ ہے اور یہ جسمِ خاکی اس کے لئے حجاب بنا رہتا ہے۔

ان تصریحات کے بعد یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ "وحی" کو جس معنی میں ادیان و ملل نے یقین کیا ہے مادیین عرصہ دراز تک اس کا انکار کرتے رہے اور چند صدی بعد جب علم نے ان پر روشنی کا مزید دروازہ وا کیا تب ان میں سے ماہرینِ علوم کی ایک بڑی جماعت نے اس کا اعتراف کیا کہ دنیائے موجود میں صرف مادہ اور محسوس ہی موجود نہیں ہے بلکہ ماورائے مادہ موجودات بھی حقیقتِ ثابتہ ہیں اور ان کا انکار علم و حقیقت کے انکار کے مرادف ہے۔

پس وہ روحانی قوت کے تو معترف ہوئے لیکن "وحی" کے متعلق اُن کے علمی تجربات نے اس سے زیادہ ان کی مدد نہیں کی کہ علم و یقین کی یہ نوع بھی دراصل انسان ہی کے اندر کی چیز ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

خارج از انسان نہیں ہے اور یہ روحانی اور باطنی شخصیت، مادی شخصیت کے پردوں میں محجوب و مستور ہے اس لئے ہم کو جرأت کے ساتھ یہ کہنا چاہئے کہ اس حد پر پہنچ کر بھی "علمِ جدید" حدِ کمال تک نہیں پہنچ سکا اور ابھی مسلسل نت نئی ترقی کی طرف گامزن ہے اور وہ وقت قریب ہی آرہا ہے جب "علمِ جدید" کو اعتراف کرنا پڑے گا کہ "وحی" کی جو حقیقت دین ومذہب کی راہ سے بیان کی گئی ہے "علمِ ظاہر" اس کے ادراک سے قاصر رہا اور اب علمی حیثیت سے بھی اس کو تسلیم کر لینے کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں ہے اور "علم" کا یہ پہلو یقیناً موجودہ تمام علوم وادراکات سے بلند ہونے کی وجہ سے ہمارے علوم سے علیحدہ نوع کا علم ہے جس کی معرفت کا ذریعہ ہم سے مستور مگر ذواتِ قدسی صفات پر منکشف ہے۔

اس لئے از بس ضروری ہے کہ وحی سے متعلق اُن مسائل کو سامنے لایا جائے جو مفہوم وحی، حقیقتِ وحی، امکانِ وحی اور وقوعِ وحی سے تعلق رکھتے ہیں تاکہ کثیف حقائق کے بعد قرآن کے اس دعویٰ کی تصدیق ہو سکے کہ وہ بلاشبہ "وحی الٰہی" ہے۔

وحی کے لغوی معنی "رازداری کے ساتھ کسی بات کی اطلاع دینا" لغت کی زبان میں "وحی" کہلاتا ہے یعنی جب کسی مخاطب کو اس طرح خفیہ خبر دینی ہو کہ دوسرے کو اس کا علم نہ ہونے پائے تو عربی میں اس اطلاع کو یوں کہتے ہیں "وحیت الیہ" "اوحیت الیہ" نیز اگرچہ "وحی" معنی مصدری کا نام ہے لیکن اکثر و بیشتر اس خبر یا اطلاع پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے جو رازداری کے ساتھ دی گئی ہو۔

اصطلاحی معنی اور دین ومذہب کی اصطلاح میں اس بات کو کہتے ہیں جو خدا کی طرف سے اس کے پیغمبر (نبی ورسول) پر القا کی جاتی ہے یا دوسرے الفاظ میں یوں تعبیر کیجئے کہ "وحی" ایسے علم وعرفان کا نام ہے انسان جس کو اپنے نفس میں اس طرح پاتا ہے کہ اس کے متعلق اعتقاد جازم کے ساتھ یہ یقین رکھتا ہو کہ یہ خدائے برحق کی جانب سے القا ہوا ہے خواہ اس علم وعرفان کے القا کے وقت کوئی آواز متمثل ہوئی ہو یا وہ بغیر آواز کے سنا گیا ہو اور وہ "قول اور لحن نے آواز نے" کا مصداق ہو۔ [1]

---

[1] یہ تعریف وحی متلو اور غیر متلو دونوں پر حاوی ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

امکان وحی | اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ اس قسم کا علم و عرفان جو عامۃ الناس سے غائب ہو مگر ان کی مصالح سے ہی تعلق رکھتا ہو۔ کیا کسی ایسے انسان کو حاصل ہو سکتا ہے جس کو خاص اسی مقصد کے لئے اللہ تعالیٰ نے منتخب کر لیا ہو؟ اگر اس کا امکان ہے تو علمی مباحث میں اس کو کس طرح ثابت کیا جا سکتا ہے اور کس شکل میں اس کو قریب الفہم اور قرینِ عقل بنایا جا سکتا ہے؟؟

تو اس سوال کے حل کرنے کے لئے آپ خود اپنی عقل و فراست کو ہی حکم بنایئے اور دریافت کیجئے کہ اس عالمِ رنگ و بو میں کیا یہ حقیقت ہر جگہ بکھری ہوئی نظر نہیں آتی کہ یہاں عقل و فہم کے تفاوت کے اعتبار سے انسان مختلف درجات رکھتے ہیں اور اس تفاوت کا یہ حال ہے کہ جس بات کو ایک انسان محال اور ناممکن سمجھتا ہے دوسرا انسان اس کو نہ صرف ممکن جانتا بلکہ اس کے وقوع کا مشاہدہ کرتا ہے اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص کی عقل و فراست جن حقائق فکر و نظر اور ترتیب مقدمات کے بعد بھی بہ مشکل سمجھ پاتی ہے۔ دوسرے شخص کا فہم و ادراک نظر و فکر اور ترتیبِ مقدمات کے بغیر بداہۃً اس کو پالیتا ہے۔

پھر درجات کا یہ تفاوت صرف کسب و تعلیم ہی کی راہ سے نہیں ہوتا کہ ایک ہستی نے تعلیمی ریاضت و محنت کے بعد عقل و فہم میں ایسی حدت اور تیزی پیدا کر لی جس کو جاہل اور عامی پیدا نہ کر سکا اور اس سے محروم رہ گیا بلکہ تفاوتِ درجات کا یہ مظاہرہ خود فطرت اور قانونِ قدرت کی جانب سے ہوتا رہتا ہے اور انسانوں میں فطری طور پر بھی یہ فرق نمایاں نظر آتا ہے اور اس میں انسان کے کسب و اختیار کو قطعاً دخل نہیں ہوتا۔

علاوہ ازیں یہ بھی عام طور پر مشاہدہ ہوتا رہتا ہے کہ بعض امور معمولی اور متوسط افہام و عقول کے نزدیک نظری ہوتے اور دلیل و برہان کے محتاج نظر آتے ہیں اور بغیر ترتیبِ مقدمات ان کا حصول نہیں ہو سکتا لیکن ان سے بلند و عالی فکر و عقل کے نزدیک وہ بدیہی ہوتے ہیں اور بغیر کسی تامل کے وہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ان کا انکشاف کرلیتی ہیں اور ظاہر ہے کہ عقل و فکر اور فہم و فراست کے درجات کے علو و ارتقار کی کوئی خاص حد معین نہیں کی جاسکتی اور اسی لئے اصحاب افکارِ عالیہ و عقول ذکیہ میں بھی درجات کا تفاوت موجود ہے یہی وجہ ہے کہ جن بعید اور عالی امور کو اربابِ ہمم قریب سے قریب تر سمجھتے اور عقل و خرد کے ذریعہ اُن کا مشاہدہ کرلیتے ہیں، کم درجہ کے اصحابِ عقول شروع میں ان کے منکر نظر آتے ہیں اور جب وہ وجود پذیر ہوجاتے ہیں تو ان کے تحقق کو حیرت و استعجاب کی نظروں سے دیکھتے اور آہستہ آہستہ اُن سے اس درجہ مانوس ہوجاتے ہیں کہ کل کے انکار اور آج کی حیرت پر شرمندہ ہوکر یہ یقین کرنے پر مجبور نظر آتے ہیں کہ گویا یہ امور کبھی قابلِ انکار ہی نہ تھے اور اب اگر اُن کے سامنے کوئی انکار کرتا ہے تو پھر اس پر اُسی طرح غیظ و غضب کا اظہار کرتے ہیں جس طرح شروع میں ذکی الفہم اور سریع العقل دانا پر ان امور کے انکار کے لئے کرتے رہے تھے۔

غرض تفاوت درجات کا یہ سلسلہ ہمیشہ سے ہے اور آج بھی موجود ہے اور نا قابلِ انکار حقیقت کی طرح موجود ہے۔

پس اگر یہ مقدمات نا قابلِ انکار اور بدیہی ہیں اور ان کے متعلق کبھی بھی دو رائے نہیں رہیں، اور آج بھی نہیں ہیں تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ ان صحیح اور بدیہی مقدمات کا جو نتیجہ اور ثمرہ لازم ہے وہ قابلِ تسلیم نہ ہو اور اس کا انکار کردیا جائے کیا ان مقدمات کا صاف اور سادہ نتیجہ یہ نہیں ہے کہ تسلیم کرنا چاہئے کہ اس عالمِ ہست و بود میں ایسی ہستیاں بھی موجود ہیں جو "فیضانِ الٰہی سے" اپنے اندر ایسا جوہر صاف اور فطرتِ عالی رکھتی ہیں جن میں یہ استعداد موجود ہے کہ وہ عالم بشریت سے پرواز کرکے عالمِ روحانیات تک پہنچتی اور عالمِ قدس میں ان علوم کا مشاہدہ کرنے کے بعد حق تعالیٰ سے ان کے لئے عینی شہادت حاصل کرلیتی ہیں عام عقول و فہم جن کا ادراک کرنے سے عاجز و قاصر ہیں یا دلیل و برہان اور ترتیب مقدمات کے بغیر ان کا حصول اُن کے لئے ناممکن ہے اور جو کچھ بڑے بڑے اصحاب عقل و فکر برسوں کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

محنتِ درس و تدریس اور تعلیم و تعلم سے حاصل کرتے ہیں یہ ہستیاں "فیضانِ الٰہی سے" فی البدیہہ اور علی الفور ان کا مشاہدہ اور معائنہ کر لیتی ہیں۔ اور پھر وہ ان علوم و عرفان کو دوسروں کی فلاح و نجاح اور اصلاح کے لئے پیش کرتی اور تعلیم و دعوت کے ذریعہ دوسروں تک ان کو پہنچاتی اور ان کے حق ہونے پر یقین دلاتی ہیں اور عقل و فراست اس نتیجہ اور ثمرہ کو بھی کیسے فراموش کر سکتی ہے کہ اس غیر محدود تفاوتِ درجات کی موجودگی میں ناموسِ فطرت اور یدِ قدرت ضرور ایسے نفوسِ عالی کو منتخب و مخصوص کرے جو ہر زمانہ میں انسانوں کی اجتماعی و انفرادی مصالحِ عامہ اور فلاحِ ابدی و سرمدی کے لئے تبلیغ و دعوت کا فرض انجام دیتے رہیں اور جب حضرتِ "انسان" دماغی اور عقلی قوٰی کے اعتبار سے سنِ رشد و بلوغت کو پہنچ جائے تو پیغام و دعوت کا یہ سلسلہ بھی ایک ایسی حد پر جا کر ختم ہو جائے جو اپنے اساسی اور بنیادی اصولوں کے اعتبار سے رشد و بلوغت کا حامل ہو اور بنیادی مقاصد میں جس کے بعد کسی مزید دعوت و تبلیغ کی حاجت باقی نہ رہے اور ان کی روشنی میں دینی و دنیوی ترقی غیر محدود پر گامزن ہو سکے۔

اب رہا یہ مسئلہ کہ ان نفوسِ عالیہ کو اگر ناموسِ فطرت کی جانب سے جوہرِ نقی اور فطانت و فراست کی وہ معراج عطا ہوئی ہے کہ جس کی بدولت فیضانِ الٰہی ان کو بغیر محنت و کاوش کے یقینی علم و عرفان بخشتا اور موہبت کرتا ہے تو اس کے لئے باطن کی یہ روشنی ہی کافی ہوتی ہے اور کسی روحانی شخصیت کا اس کے اور خدائے برتر کے درمیان کوئی واسطہ نہیں ہوتا تو اس دعوٰی کے لئے اگر علمی برہان و دلیل موجود ہے تو پیش کی جائے ورنہ بآسانی یہ کہا جا سکتا ہے کہ جب علم جدید و قدیم دونوں متفق ہیں کہ اس عالم کیف و کم میں ایسے وجود کا پتہ لگتا ہے جو اس مادۂ کثیف سے بھی زیادہ لطیف جوہر سے بنے اور ہماری ان نگاہوں اور ظاہری حواس سے پوشیدہ ہیں اور نہ صرف یہ بلکہ ان حقائق اقرار آج علمی تجربیات کے ذریعہ کیا جا رہا ہے نہ کہ خوش فہمی اور تقلید کی راہ سے تو اس کے تسلیم کرنے میں کیا علمی قباحت لازم آتی ہے کہ ان ہی لطیف وجودات و حقائق میں سے بعض وہ لطیف وجود بھی ہیں جو علمِ الٰہی اور فیضانِ الٰہی کو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ان مقدس ہستیوں تک پہنچاتے اور علم و عرفانِ الٰہی کو ان پر روشن و متجلی کرتے ہیں نیز نزولِ وحی میں آواز کا تمثل یا روح (فرشتہ) کا تشکل نہ عقل کے خلاف ہے اور نہ علمی نگاہ میں بے حقیقت یا خرافی ہے کیونکہ وہ جواہرِ معقولہ جو مادہ کثیف سے زیادہ لطیف حقیقت رکھتے ہیں اور جن کا ثبوت علمی ذرائع یعنی ثبوتِ ارواح کے عنوان سے حاصل ہو چکا ہے اپنی حقیقت کے ساتھ متشکل و مصور ہو کر ایک حقیقتِ ثابتہ کی طرح ان نفوسِ قدسیہ کو نظر آتی اور ان سے خطاب و تکلم کرتی ہیں تو علمی تحقیق کا وہ کونسا گوشہ ہے جو اس کو ناممکن اور غیر معقول قرار دے سکتا ہے؟ اور اس تسلیم میں کونسی علمی قباحت لازم آتی ہے کہ ان ارواح اور جواہر معقولہ کا تشکل نفوسِ قدسیہ کے ساتھ اس لئے مخصوص ہے کہ ید قدرت نے ان کے مزاج اور ان کی طبع و فطرت کا سانچہ دوسرے انسانوں کے مزاج کے مقابلہ میں ایسا مخصوص اور رفیع و بلند بنایا ہے کہ عام انسانی مزاج اس کی رفعت کا ادراک نہیں کر سکتے اور خدائے بخشندہ کی کارسازی اس کو صرف نفوسِ قدسیہ ہی کے لئے خاص رکھتی ہے۔

یہ جدا بات ہے کہ ایک مادہ پرست کی طبیعت ہی چونکہ ان حقائق کے اعتراف سے انکار کرتی ہے اور وہ اپنے انکار کو علمی دلائل سے ثابت کرنے کی بجائے محض "انکار" ہی کو دلیل بنا لینا چاہتی ہے تو اس تعصبِ بیجا کے سامنے ہر قسم کی دلیل بے سود ہے۔

البتہ یہ کہا جائے گا کہ علم نے ابھی اس حد تک ترقی نہیں کی کہ وہ اس "ذریعۂ علم" کی حقیقت کو پا سکے جس کو نفوسِ قدسیہ یقین جازم کے ساتھ پا لیتے ہیں اور اعتقاد رکھتے ہیں کہ یہ خدا کی جانب سے ہے اور یہی امتیاز و خصوصیت ان کو رسول، نبی، اور پیغمبر کے القاب سے مشرف کرتے ہیں البتہ بعض ایسے نفوسِ قدسیہ بھی ہوتے ہیں جن کے مزاج اور فطرت کی ساخت اگرچہ ان پیغمبروں کے مزاج سے قریب تر ہوتی ہے لیکن باوجود اس کے وہ اس حد کامل اور "مثل اعلیٰ" تک نہیں پہنچ پاتے اور اُن کے ادراکات عقل و فراست اس سے نازل رہتے ہیں اور تفاوتِ عقل و فطرت کا مزید ثبوت پہنچانے ہیں بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مرتبۂ رفیع کی رفعت کے لئے صرف یہی کہا جا سکتا ہے ؎

ایں سعادت بزورِ بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

وقوعِ وحی اس علمی بحث کے بعد بات اس درجہ پر پہنچ جاتی ہے کہ اب یہ غور کیا جائے کہ جس خاص علم کا نام "وحی" ہے کیا علمی و عقلی امکانات کے ساتھ ساتھ اس عالمِ ہست و بود میں اس کا وجود رہا ہے یا وہ آج بھی موجود ہے تو اس کا جواب "تاریخ" سے لینا چاہیے نہ کہ عقلی مباحث سے "الٰہیات" اور "مابعد الطبیعات" کے مسائل میں علمائے عقلیین کی سب سے بڑی گمراہی یہی رہی ہے کہ انھوں نے عالمِ غیب کے حقائق کے صرف امکانات پر ہی علمی دلائل و براہین کا زور صرف نہیں کیا اور اقرار و انکار میں سے کسی ایک کو دلیلِ راہ نہیں بنایا بلکہ اس کے وجود کے اثبات و انکار پر بھی نظری دلائل سے کام لینے کی سعی ناکام کی ہے حالانکہ یہ نظری دلائل کی جگہ تاریخی ثبوت و عدم ثبوت کے محتاج ہیں اور اسی لئے ہونا یہ چاہئے تھا کہ عالمِ غیب سے متعلق جس مسئلہ پر بحث کی جاتی اول اُس کے امکان پر ہوتی اور اس کے لئے دلائلِ عقلی و نظری کو راہنما بنایا جاتا اور اگر اس کا امکان ثابت ہو جاتا تو پھر نظر و فکر کے رُخ کو نظری دلیل کی جانب نہیں بلکہ تاریخی ثبوت کی جانب پھیر دیا جاتا اور تاریخ سے دریافت کیا جاتا کہ کائنات میں اس مسئلہ کا وجود رہا بھی ہے یا نہیں۔

مگر اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ کسی مسئلہ میں تاریخی ثبوت کا مطلب یہ ہے کہ اس وقت عقل اپنی دلیل اور اپنے برہان سے تہی دامن ہو کر تاریخی ثبوت کو راہنما بناتی ہے بلکہ مقصد یہ ہے کہ سوال کے حل کے لئے عقلی دلیل، تاریخی ثبوت سے وابستہ ہو کر راہنما بنے گی صرف نظری بحث اس کے حل کیلئے کافی نہیں ہو سکتی

پس اس صورتِ حال کو پیشِ نظر رکھ کر جب ہم اس پر غور کرتے ہیں کہ قرآن کیا "وحیِ الٰہی" ہے تو تاریخ آگے بڑھ کر پُرشوکت الفاظ میں اس سچائی کا اعلان کرتی ہے کہ بلاشبہ قرآن "الوحی" ہے اور یہ اس لئے کہ جس مقدس ہستی پر اس کا نزول ہوا ہے ہر ایک مورخ پر تاریخ یہ روشن کرتی رہی ہے کہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وہ ہستی رسمی علوم سے ناآشنا، ہر قسم کے مادی اسباب و وسائلِ علمی سے محروم، ہر قسم کی علمی سوسائٹی سے بے وسیلہ، وقتی علوم مدونہ سے بوجہ امی ہونے کے ناواقف، مقامِ پیدائش و تربیت کے لحاظ سے ناسازگار فضا میں تربیت یافتہ، غرض ہمہ قسم کے ذرائع علم و اخلاق سے بیگانہ مگر ذاتی اخلاق و کردار کے اعتبار سے اوصافِ حمیدہ میں ممتاز، باطنی کمالات و محاسن میں کامل و مکمل انسانی ہستی تھی جس نے عمر کے چالیس سال اپنی قوم کے ہر فرد بشر کے سامنے اسی حال میں گذارے کہ اچانک ایک روز یہ دعوی کرتا نظر آتا ہے کہ وہ خدا کا پیغمبر اور رسول ہے اور ساتھ ہی اپنی قومی زبان میں ایسا پیغام سناتا ہے جو ایمانیات و اعتقادات، اعمال و افعال، اخلاق و کردار کے علمی کمالات کا مخزن، دینی، سیاسی، معاشی اور معادی علوم و عرفان کا معدن، انفرادی و اجتماعی دستور و آئین کا منبع ہے اور نہ صرف یہ کہ اپنے الفاظ و عبارات اور نظم و معانی میں معجزہ ہے بلکہ وہ پیغام کہ جس کی تعلیم اپنے عاملینِ حقیقی کے لئے عظیم الشان اور محیر العقول انقلاب و اصلاح کی کفیل اور عروج و اقبال اقوام و امم کی ضامن ثابت ہوئی اور ثابت رہی ہے۔ غرض اس کے متعلق تاریخ ادیان و ملل کا یہ فیصلہ ہے کہ بلاشبہ یہ پیغام حیاتِ ابدی کے لئے سرمایہ نجات اور فلاح و نجاحِ دنیوی کے لئے ذخیرۂ سعادت ہے اور اس کو پیش کرنے والا اُن نفوس قدسیہ میں سے ہے جس کی زندگی کا ہر ایک لمحہ ہر قسم کے رذائل سے پاک اور ہمہ قسم کے فضائل و فواضل سے روشن ہے تو جبکہ وہ اپنی صداقت مآبی اور دوست و دشمن کی جانب سے الصادق الامین کے لقب سے متصف حیاتِ طیبہ کے باوجود یہ دعوی کرتا نظر آتا ہے کہ اس کا یہ پیغام اپنا نہیں بلکہ خدا کا پیغام (الوحی) ہے تو اس کے دعوی کی تکذیب علم کا کام نہیں جہل کی ڈیوٹی ہے لہذا اس کے پرکھنے اور معیارِ حقیقت پہ کسنے والے کے لئے جس طرح یہ ضروری ہے کہ وہ علمی دلائل سے اس کی صداقت کا امتحان کرے، اسی طرح یہ بھی اس کا فرض ہے کہ وہ تاریخی حقائق کی ترازو میں بھی اس کو تولے اور دونوں طرفِ امتحان کے بعد فیصلہ کرے کہ قرآن کا یہ دعوی کہ وہ "وحی الٰہی" ہے غلط ہے یا صحیح، درست ہے یا نادرست۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پس جو شخص بھی اس صحیح طریقِ امتحان کو اختیار کرے گا قرآن یقین دلاتا ہے کہ آخر کار اس کو یہ کہنا ہی پڑے گا کہ بلاشبہ قرآن "الوحی" ہے۔ چنانچہ سورۂ انبیا میں قرآن نے اس حقیقت کا یوں اعلان کیا ہے۔

قل انما انذرکم بالوحی	کہہ دیجئے! میں جو تم کو ڈراتا ہوں سو "الوحی" کے ذریعہ
ولا یسمع الصم الدعاء	اور حقیقت یہ ہے کہ سنتے نہیں بہرے پکار کو جب
اذا ما ینذرون۔	کوئی ان کو ڈر کی بات سنائے۔

اور سورۂ طٰہٰ میں بھی اس طرح کہا ہے۔

ولا تعجل بالقرآن من قبل	اور تم قرآن کے لینے میں جلدی نہ کرو جب تک
ان یقضیٰ الیک وحیہ۔	پورا نہ ہو چکے تم پر اس کا اترنا۔

القرآن قرآنِ عزیز نے اپنی صفاتِ عالیہ اور اوصافِ کاملہ کا جس اعجازِ بیان کے ساتھ اظہار کیا ہے اس کی تفصیل گذشتہ صفحات میں زیرِ نظر آ چکی ہے اور تمام صفاتِ حسنہ کے مجموعہ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ یہ کامل دستورِ صداقت، مکمل کتابِ ہدایت، اعلیٰ پیغامِ سعادت اور آخری برہانِ کرامت ہے، یہ نورِ روشن، روحِ حیات، حق و موعظت، ذکر و ذکریٰ اور حق و مصدق ہے، آیاتِ بینات ہے، کلامِ الٰہی ہے، صراطِ مستقیم ہے، اور مبارک ہے، علی و حکیم ہے، مصدق و مہیمن ہے اور حکم و حکمۃ ہے، تنزیل ہے، مثانی و متشابہ ہے، احسن الحدیث، حبل اللہ اور بشیر و نذیر ہے، عدل ہے، علم ہے اور منادی للایمان ہے اور اور یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ وہ "الوحی" ہے۔

پس جب تم قرآن کے ان صفات کا مطالعہ کرتے اور اس کے نظم و معانی میں ان تمام اوصاف کی جھلک پاتے یا ان کو منور و روشن دیکھتے ہو تب تمہارا وجدان، تمہارا قلب اور تمہارے شوق و اشتیاق سے ایک پیاسے کی طرح اس کی تلاوت و قرارت کے لئے مضطرب و بے چین ہو جاتی ہے اور جی چاہتا ہے کہ اس کے اعجازِ بیان اور حلاوتِ نظم پر پروانہ وار نثار ہو جائیں اور بار بار اس کو دہرائیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور اس طرح روح کو تازگی اور نور قلب کے لئے بالیدگی کا سامان مہیا کریں۔

آپ دنیائے علم کے ہر گوشۂ ماضی و حال کی تفتیش کیجئے تو آپ پر یہ حقیقت روشن ہو جائیگی کہ اس عالمِ رنگ و بو میں کوئی کتاب، کوئی دستور، اور کوئی تحریر ایسی نہیں ہے جس کی تلاوت و قرأت اپنے اندر وہ جاذبیت رکھتی ہو جو قرآن کے ساتھ مخصوص ہے کہ اُس کے معانی اور علوم و معارف کے فہم سے نا آشنا ہونے کے باوجود بھی اس کو الف سے یا تک حرف بحرف یاد رکھنے اور پڑھنے والوں کی تعداد ہر قرن اور ہر زمانہ میں لاکھوں اور کروڑوں کی رہتی ہے اور یہی وہ نثر ہے جو نظم شیریں سے بھی زیادہ اپنی قرأت و تلاوت میں حلاوت و عظمت رکھتی ہے۔

کیا یہ حقیقت نہیں کہ قرآن کے دورِ نزول سے آج تک جس قدر بے شمار حفاظ اس کتاب کے حافظ رہے ہیں دنیا اور دین کی کسی کتاب اور کسی تحریر کو اس کا ہزارواں حصہ بھی نصیب نہیں ہوا اور اس کی نمایاں وجہ یہی ہے کہ وہ اپنے نظم و الفاظ میں حد اعجاز پر ہے جس کا مقابلہ کوئی کتاب نہیں کر سکی اور نہیں کر سکتی ہے اس لئے ماضی و حال بلاشبہ مستقبل کے آئینہ دار ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ قرآنِ حکیم جب یہ کہتا ہے کہ میں "القرآن" ہوں تو اس کے معنی صرف یہی نہیں ہوتے کہ وہ بھی دوسری کتابوں اور تحریروں کی طرح پڑھی جاتی ہے اس لئے قرآن ہے بلکہ وہ اس حقیقت مسطورہ بالا کو پیش نظر رکھ کر یہ کہتا ہے کہ جبکہ میرے پڑھے جانے اور میرے نظمِ الفاظ کو دہرائے جانے میں بھی دوسری تمام کتابوں اور تحریروں پر خصوصی امتیاز حاصل ہے تو یہ کہنا حق بجانب ہے کہ قرأت در اصل میری قرأت ہے اور نہ صرف میرے اوامر و نواہی کے امتثال سے سعادتِ کبریٰ حاصل ہوتی ہے بلکہ میرے کلامِ الٰہی ہونے کی وجہ سے میری قرأت و تلاوت بھی صد ہزار سعادتوں کا مجموعہ ہے اور اس لئے میں بلاشبہ "القرآن" ہوں۔

اور جبکہ نظم و معانی کے انسجام و اعجاز کے ساتھ میرا پیغام تمام کائناتِ انسانی بلکہ ہر ذی روح

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے لئے آخری پیغامِ حیات ہے اور ابدی و سرمدی نجات کا کفیل، حکمتِ بالغہ کا حامل، عظمت و کرامت کا پیکر، مجد و شرف کا معدن، عزت و غلبۂ حق کا مہبط ہے اور اس لئے کتبِ سماویہ میں میرا وجود حیرت و تعجب کا مرکز بن گیا ہے۔ پس اس میں کیا شبہ ہے کہ میں "قرآن مجید" بھی ہوں اور "قرآنِ کریم" بھی، "قرآن مبین" بھی ہوں اور "قرآنِ حکیم" بھی، "قرآن عربی" بھی ہوں اور "قرآنِ عجب" بھی، "قرآنِ عظیم" بھی ہوں اور "قرآن ذی الذکر" بھی۔

اور چونکہ میری صفتِ "قرآن" یا "القرآن" ایک نمایاں صفت ہے اس لئے میری رشد و ہدایت کے پیغام میں جگہ جگہ اس صفت کا کبھی تنہا اور کبھی صفاتِ بالا سے متصف اظہار کیا گیا ہے۔

چنانچہ بقرہ، نسار، مائدہ، انعام، اعراف، یونس، توبہ، نحل، اسرائیل، فرقان، زخرف، حجر، طٰہٰ، نمل، قصص، یوسف، احقاف، قمر، رحمٰن، مزمل، دہر، حشر، روم، سبا، حم، ق، ص، رعد، قیامہ، انشقاق میں ایک جگہ یا متعدد جگہ قرآن یا القرآن مذکور ہے اور سورۂ بروج میں "بل ہو قرآن مجید" آیا ہے اور سورۂ یٰسین میں "قرآن مبین" اور سورۂ حجر میں "القرآن العظیم" اور سورۂ یٰسین میں "القرآن الحکیم" اور سورۂ ص میں "القرآن ذی الذکر" اور سورۂ ق میں "القران المجید" اور سورۂ یوسف، طٰہٰ، شوریٰ، زخرف میں "قرآناً عربیاً" اور سورۂ جن میں "قرآناً عجباً" کہا گیا ہے۔

غرض یہ ہیں وہ صفاتِ عالی اور اوصافِ برتر جو مجموعۂ کمالات کے لحاظ سے قرآنِ عزیز کو نہ صرف نظامہائے دنیوی اور دساتیر بشری سے ممتاز کرتے ہیں بلکہ تمام کتبِ سماویہ پر فضیلت و برتری ظاہر کرتے ہیں اور "کلامِ الٰہی" ہونے کا ثبوت واضح اور برہان روشن پیش کرتے ہیں۔

ذلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء واللہ ذو الفضل العظیم

© rasailojaraid.com